اسلام اور مغرب
(ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ کے افکار کا خصوصی مطالعہ)
Islam and the West (Specific Study of Dr. Ghazi's Thoughts)

ڈاکٹر عبدالقادر بزدار*

محمد انس حسان**

Abstract:

The comparative study of civilizations, their conflicts, clashes and their harmony are the significant issues of this era. It's a reality that in the present clash of civilizations, Islam is being pushed to a tight corner. The Islamic world today is facing severe challenges and odd circumstances in maintaining their vital values and re-establishing their identity and gaining their due place in the modern world because some of the western thinkers believe that after demolishing the Soviet Union, their next encounter would be with the ideology of Islam. In this situation, the comparison of civilizations and their comprehension has acquired a significant place and it is necessary to highlight the essential elements of various civilizations in such a way that they can sustain their individuality and the misunderstandings among them may be removed to create a peaceful atmosphere which is based on love, mutual tolerance, co-existence and the supremacy of basic human rights so that the world may return to the merger of various civilizations and harmony among different religions.

Allama Iqbal is the thinker who has shown extraordinary depth in his approach towards the study of Islam and the western world, highlighting their differences and the traditions, points and levels of their merger and harmony with a balanced and impartial approach. It's necessary to comprehend Iqbal's ideas keeping in view the history of Islam and the western world, the current demands of the present age and considering organized, solid, argumentative analysis in an objective way revealing the soul of

* اسسٹنٹ پروفیسر، پوسٹ گریجوایٹ سنٹر، شعبہ علوم اسلامیہ، گورنمنٹ ایمرسن کالج ملتان، پاکستان۔

** لیکچرر اسلامیات، گورنمنٹ کالج، جہانیاں

Islam and the spirit of the west in context of Iqbal's philosophy so that the modern world can move towards a peaceful and creative situation.
Dr. Mehmood Ahmad Ghazi was the realization of Iqbal's dream. He is simultaneously an educationist, a great researcher and an illustrator and interpreter of the Holy Quran and narrator of Hadiths. His personality was equally well versed in Islamic art and learning and all their offshoot disciplines. It's the trait of his personality that in spite of travelling far and wide and having done a vast study, he is not impressed at all except by the ideology of Islam. He has very successfully passed on the ancient heritage to its modern heirs with honesty, skill and sagacity. Here an effort has been made to present a review of his views where he has propounded a critical, analytical and scholarly analysis of the western world.

دین اسلام چونکہ ایک عالمی اور آفاقی دین ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں اور تمام شعبہ ہائے جات کے لیے راہنمائی فراہم کرتا ہے اس لیے اس کا دائرہ کار دنیا و آخرت سے متعلق تمام علوم مثلاً فلسفہ، الٰہیات، نفسیات، سماجیات، معاشیات اور سیاسیات جیسے تمام علوم پر محیط ہے۔ تاہم یہ کہنا بے جانہ ہوگا کہ عام طور پر کسی شخص کے لیے مذکورہ تمام علوم میں یکساں مہارت و عبور حاصل کرلینا تقریباً محال ہے۔
لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ قرآنی حکم "وخاتم النبیین"[۱] اور اعلانِ رسالت مآب ﷺ "لا نبی بعدی"[۲] کے بعد "العلماء ورثۃ الانبیاء"[۳] کے مصداق یہ اعزاز امت محمدیہ کے ان قابل قدر اور عصری تقاضوں سے آشنا علماء ربانیین کو ہر دور اور ہر معاشرہ میں حاصل رہا ہے کہ وہ دین اسلام کو درپیش مسائل اور پیش آمدہ مشکلات کا انبیاء کے جانشین ہونے کی حیثیت سے نہ صرف مقابلہ کرتے رہے ہیں بلکہ امت کو پیش آنے والے ان مسائل کا نہایت معتدل اور متوازن حل بھی پیش کرتے رہے ہیں۔ تاریخ اسلام کے ہر دور میں اس دور کے عملی تقاضوں کو قرآنی ہدایات اور آسمانی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے والے ایسے رجال پیدا ہوتے رہے ہیں[۴] جنہوں نے اپنی انفرادی صلاحیتوں اور محنتوں سے وہ کام کر دکھائے ہیں جو شاید بڑی بڑی انجمنیں اور اداروں سے بھی ممکن نہ تھا۔
دورِ حاضر میں عالم اسلام کو جن مسائل و مشکلات کا سامنا ہے شاید تاریخ میں اس کی دوسری مثال پیش کرنا ممکن نہ ہو۔ عالمِ اسلام آج علمی اور عملی لحاظ سے بہت اچھی حالت میں نہیں ہے۔ اسلامی

تہذیب اور تشخص کی حفاظت ایک مسلمان کے لیے مشکل ہو چکی ہے۔ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ آج ہمارے محققین اسلامی تاریخ کے سنہری ادوار کے راگ الاپ کے بزعم خویش مطمئن ہوئے بیٹھے ہیں کہ ہم ایسی تابناک تاریخ کے وارث ہیں اور اہلِ یورپ ہمارے سائنسدان اور محققین کی تحقیق کے نتیجہ میں ترقی کر گئے۔ اس میں کوئی دورائے نہیں کہ ہمیں اپنی اس تاریخ پر فخر ہونا چاہیے لیکن سوال یہ ہے کہ عملی طور پر ہمارا موجودہ کردار کیا ہے؟ حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ [۵] نے شاید اسی لیے فرمایا تھا کہ:

تجھے آباء سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
کہ تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارہ

علامہ محمد اقبال ہی نے آج سے تقریباً ستر سال قبل اسلام کو درپیش مسائل کے حوالہ سے فرمایا تھا کہ ": میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص زمانۂ حال کے اصول قانون (jurisprudence) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی ہوگا۔۔۔۔۔۔۔ کیونکہ میری رائے میں مذہب اسلام گویا زمانہ کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔" [۶]

ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ (۱۳۷۰ھ تا ۱۴۳۱ھ / ۱۹۵۰ تا ۲۰۱۰ء) اقبال کے اسی خواب کی تعبیر تھے [۷] وہ بیک وقت مفسر، محدث، ماہرِ تعلیم اور اعلیٰ درجہ کے محقق تھے اور اسلامی و بین الاقوامی قانون میں انہیں کمال درجہ کا تفقہ حاصل تھا۔ ان کی شخصیت اسلامی علوم و فنون کے جملہ شعبہ ہائے جات پر مساوی طور پر حاوی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کی انفرادی خصوصیات اور شخصی خصائل پر کافی کچھ لکھا گیا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس وقت سب سے زیادہ اہم کام یہ ہے کہ وہ جو کچھ اپنے افکار و خیالات کی شکل میں چھوڑ گئے ہیں ان سے استفادہ اور اس کی عملی تشکیل کے حوالہ سے ہم ایک منصوبہ بند جدوجہد کی ابتدا کریں۔

ڈاکٹر صاحبؒ کے افکار و خیالات امتِ مرحومہ کے مرض کی نہ صرف صحیح تشخیص پیش کرتے ہیں، بلکہ ان میں ایک گونہ سنجیدگی، متانت اور بالغ نظری کی جھلک واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ ان کی شخصیت کی ایک اہم خوبی یہ ہے کہ وہ نہایت وسیع مطالعہ اور دنیا کے مختلف اطراف میں گھومنے کے باوجود اسلام کے علاوہ کسی نظام اور نظریے سے مرعوب نہیں ہوئے۔ انہیں عالمِ اسلام کو بڑے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا جس کے نتیجے میں وہ امت مرحومہ کے عروج و زوال کی اس تاریخ میں سے اپنی متاع گم گشتہ

کی بازیافت میں بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جدید دور کے اس پہلو سے ایک قدیم انسان تھے کہ انہوں نے اپنے قدیم ورثے کو جدید ورثاء میں نہایت دیانتداری، مہارت اور دانشمندی سے منتقل کرنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر صاحبؒ کے افکار کی بہت سی جہات ہیں جن میں سے ہر ایک پر گفتگو بڑی تفصیل کی متقاضی ہے۔ تاہم ہم نے ان سطور میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ان افکار کا جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے جن میں انہوں نے عالم مغرب کے افکار اور کردار کا ایک ماہرانہ تجزیہ و تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

اسلام اور مغرب کی کشمکش کا تاریخی پس منظر:

آج سے ربع صدی قبل مغرب سے مراد صرف یورپ بالخصوص برطانیہ سمجھا جاتا تھا مگر آج یہ اصطلاح یورپ کے ساتھ امریکہ کا بھی احاطہ کرتی ہے۔ چنانچہ آج جب ہم یہ لفظ بولتے ہیں تو اس سے ہماری مراد یہود و نصاریٰ ہوتے ہیں۔ چونکہ اسلام اور عالم اسلام کو سب سے زیادہ واسطہ انہی دو اقوام سے پڑنا تھا اس لیے قرآن حکیم نے ان کے حوالہ سے وہ تمام تفصیلات مہیا کی ہیں جن کی روشنی میں ہم ان اقوام سے اپنے تعلقات اور ترجیحات کا تعین کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مغرب اور اسلام کی موجودہ کشمکش کا پس منظر اس طرح بیان کرتے ہیں:

"امتِ مسلمہ کے عالمگیر کردار میں یہ بات بنیادی طور پر شامل ہے کہ ان کا ایک طویل عرصہ تک یہودیوں اور عیسائیوں سے واسطہ رہے گا، مقابلہ کی نوعیت پیش آتی رہے گی، تصادم ہوتا رہے گا، اور اس تصادم کے لیے مسلمانوں کو یہ دو سورتیں (سورۃ البقرہ اور سورۃ آل عمران) تیار کر رہی ہیں۔"[۸]

مغربی تہذیب کے حوالہ سے ایک غلط فہمی کا ازالہ:

ہمارے بہت سے محققین اور دانشوروں میں یہ خیال عام پایا جاتا ہے کہ مغرب نے اپنی تہذیب کو سیکولرزم میں ڈھال لیا ہے اور مذہب کے حوالہ سے مغرب میں ایک سیکولر ذہنیت نے جنم لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ اسے مسلمانوں کی سادہ لوحی قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"ہمارے ہاں بہت سے حضرات سادہ لوحی سے مغرب کا مطالعہ کرتے ہیں اور مغرب کے ظاہری دعووں سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب نے مذہب کو گھر سے نکال دیا ہے اور اب مغرب ہر مذہبی تعصب سے آزاد ہے۔ وہ حضرات یہ بھول جاتے ہیں کہ مغرب نے مذہب کو ایک خاص علاقے سے نکالا ہے، گھر سے نہیں نکالا۔ مغرب کی ہر چیز عیسائی تہذیب و تمدن، عیسائی روایات اور عیسائی تعصّبات پر مبنی ہے"۔[۹]

مغرب کی تہذیبی ترجیحات ومقاصد :

ڈاکٹر صاحبؒ دنیائے اسلام اور مغرب کی تہذیبی ترجیحات کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ :

''یہ تاریخی حقیقت نظروں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ اہل مغرب کی پیش قدمی دنیائے اسلام میں جب بھی ہوئی، تجارت اور اقتصادی خوشحالی کے نام پر ہوئی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی تہذیب کو دنیائے مغرب ومشرق میں جب بھی پیش قدمی حاصل ہوئی وہ اخلاق و کردار اور روحانی مقاصد کے نام پر ہوئی۔''(۱۰)

یہ وہ فرق ہے جو اسلام اور مغرب کی ترجیحات کے حوالہ سے واضح طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

مغربی بالادستی اور اس کے اثرات :

اگرچہ مغرب تجارت، معیشت، سیاست اور حربی ایجادات کی بنیاد پر مسلمانوں پر بالادستی قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے لیکن اس سے زیادہ خطرناک بات جو سامنے آئی وہ یہ تھی کہ مسلمانوں کے افکار وخیالات بھی اس سے متاثر ہونے شروع ہوگئے۔

اس حوالہ سے ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ :

''یہ بالادستی شروع میں سیاست، عسکریات، تجارت اور معیشت کے میدان میں تھی اور اتنی زیادہ خطرناک نہیں تھی۔ لیکن بالتدریج اس کا اثر مسلمانوں کی ذہنیت پر، مسلمانوں کے خیالات وافکار پر اور بالآخر تہذیب وتمدن پر پڑنا شروع ہوا اور نتیجہ یہ نکلا کہ دنیائے اسلام کے پیشتر حصے میں تعلیم یافتہ اور باثر حضرات کی بڑی تعداد نے مغرب کے تصورات، مغرب کے خیالات اور مغرب کے افکار کو ایک طے شدہ اصول اور قابل قبول معیار کے طور پر اپنالیا۔''(۱۱)

سوفیصد تعلیم کو سوفیصد جہالت میں بدلنے کا تحفہ :

مغرب کے افکار و خیالات سے متاثر ہونے والے ایک مخصوص طبقے کا کہنا ہے کہ مغرب نے ہمیں سویلائزڈ کیا ہے۔ چنانچہ مغرب کی دیکھا دیکھی ان کی تہذیب و تمدن کی اتباع کی جائے۔ لیکن ڈاکٹر صاحبؒ اسے خوش فہمی اور سادہ لوحی پر محمول کرتے ہیں اور مغرب کے استحصالی رویہ پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

''انیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں میں پنجاب میں سو فیصد تعلیم تھی۔ اور بحیثیت مجموعی ۸۴ فیصد تھی اور جب انگریز ۱۹۴۷ء میں ہندوستان سے گیا تو پنجاب میں مسلمانوں میں تعلیم کا تناسب

۴ فیصد تھا۔ انگریز سو کو چار پر لے آئے اور پوری قوم کو جاہل چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ ہے اس دعویٰ کی حقیقت جو کیا جاتا ہے کہ مغربی ممالک کا ایک سویلائزنگ رول تھا۔ آج بھی ہمارے ہاں بہت سے سادہ لوح اور مشرق بیزار لوگ کہتے ہیں کہ انگریز نے ہمیں سویلائز کر دیا۔ یہ سویلائز کیا کہ سو فیصد تعلیم کو سو فیصد جہالت میں بدل دیا۔"[۱۲]

اسلامی تہذیب و اقدار سے مایوسی کا پروپیگنڈہ:

اہل مغرب کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ اہل مشرق کو اپنی پیروی پر آمادہ رکھا جائے۔ چنانچہ اس کے لیے انہوں نے مسلمانوں میں یہ سوچ پیدا کی کہ ان کی تہذیب کھوکھلی ہو چکی ہے، ان کی اقدار کی کوئی وقعت باقی نہیں رہی۔ لہٰذا انہیں مغرب کی اقتداء کرنی چاہیے کیونکہ دنیا کو سویلائز کرنے کا اعزاز اور اقوام عالم کی رہنمائی کا حق اب انہیں حاصل ہے۔ اس تمام پروپیگنڈے کا مقصد محض یہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کی شاندار تہذیب کے مستقبل سے بالکل مایوس کر دیا جائے۔ اس تمام صورتحال پر ڈاکٹر صاحبؒ نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

"آج اگر ہمارا نوجوان اپنے مستقبل سے، اپنے ملک کے مستقبل سے، تہذیب کے مستقبل سے مایوس نظر آتا ہے یا بے یقینی کا شکار نظر آتا ہے تو اس کے اسباب گزشتہ ڈھائی تین سو سال کی مغرب کی تاریخ میں تلاش کرنے چاہئیں۔"[۱۳]

دہشت گردی کا آغاز مغرب سے ہوا:

اسلام امن کا داعی ہے تاہم آج کل مغرب آئے روز یہ پروپیگنڈہ کرتا رہتا ہے کہ مسلمان دہشت گرد ہیں۔ وہ بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار بنا رہے ہیں اور ان کی وجہ سے دنیا کا امن خطرے میں ہے۔ عراق کو اسی الزام کی بھینٹ چڑھا دیا گیا اور اب ایران کے حوالے سے بھی آئے دن الزامات آ رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ مغرب کے اس پروپیگنڈے کا جواب ان الفاظ میں دیتے ہیں:

"آج مغربی دنیا شکایت کرتی ہے کہ ماس کلنگ یا بڑے پیمانے پر تباہی پھیلانے والے ہتھیار بنائے جا رہے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ماس ڈسٹرکشن کے یہ ہتھیار سب سے پہلے مغربی دنیا نے بنائے تھے اور ان ہی ہتھیاروں کی مدد سے دنیائے اسلام پر ان کا قبضہ مستحکم ہوا اور مستحکم رہا۔"[۱۴]

اسلام اور مغرب کا نظریہ ارتکاز دولت:

اسلام ارتکازِ دولت کا مخالف ہے۔[۱۵] اسلامی تعلیمات کی رو سے دولت کا چند افراد میں گردش کرتے رہنا بڑا برا سمجھا جاتا ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ دولت گردش کرے اور اس کے لیے اسلام نے زکواۃ،

صدقات اور وراثت جیسے اہم اصول متعارف کروائے ہیں۔ تاہم مغرب نے اس کے بالکل برعکس دولت کے ارتکاز کو ایک اصول کے طور پر اپنایا ہے۔ مغرب کے اس اصول پر تنقید کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ:

''مغربی دنیا نے دولت کے ارتکاز کو ایک اصول کے طور پر اپنایا ہے۔اس لیے وہاں بہت سے ایسے تصورات اور قوانین موجود ہیں جو ارتکاز دولت کو نا صرف یقینی بناتے ہیں بلکہ اس میں اضافے کا ذریعہ بھی بنتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے یہاں اس طرح قانونِ وراثت نہیں ہے جس طرح کا شریعتِ اسلامیہ میں ہے۔۔۔۔۔۔ وہاں تو یہ بات فرد کے ذاتی صوابدیدی اختیار پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ اپنی دولت جس کے نام کرنا چاہے کردے۔ بعض لوگ کتوں کے نام وصیت کردیتے ہیں، کوئی بلی کے نام کردیتا ہے۔''(۱۶)

مغرب کا ہمہ گیر ایجنڈا:

مغرب مسلمانوں کے حوالہ سے ایک ہمہ گیر ایجنڈا رکھتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ دنیائے اسلام اپنے آپ کو مکمل طور پر مغرب کے رنگ میں رنگ لے۔اس حوالہ سے ڈاکٹر صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ:

''مغرب کا ایجنڈا ایک ہمہ گیر ایجنڈا ہے اور اس میں سیاست، معیشت، تجارت و مالیات اور تعلیم و ثقافت سے لے کر فرد اور خاندان تک ہر چیز شامل ہے۔''(۱۷)

غالباً ۱۹۹۵ء میں ڈاکٹر صاحب نے جرمنی میں ایک کانفرنس میں شرکت کی۔ اس کانفرنس میں بہت سے مغربی اسکالرز بھی موجود تھے ان کی موجودگی میں ڈاکٹر صاحبؒ نے عالمِ اسلام میں مغرب کے اثرات کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تین رویوں کا ذکر کیا۔

(i) مغرب کی شدید مخالفت کا رویہ

(ii) مغرب سے مرعوبیت کا رویہ

(iii) ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' کا رویہ

ڈاکٹر صاحبؒ کے مطابق یہ آخری رویہ بہت اہم ہے۔ اس لیے کہ اس اصول سے مسلمانوں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا ہے کہ جو چیز اچھی ہے وہ لے لو اور جو بری ہے وہ چھوڑ دو۔ لیکن کیا مغرب بھی اس رویہ کی حمایت کرتا ہے؟ اور کیا وہ اس کے لیے تیار ہے کہ مسلمان اس کی سائنسی ترقی سے تو استفادہ کریں مگر اس کی تہذیب پر عمل نہ کریں۔اس حوالہ سے ڈاکٹر صاحبؒ نے اس کانفرنس میں موجود دیگر مغربی مستشرقین

سے گفتگو کی اور اپنا یہ موقف پیش کیا تو ان کے جواب کا ماحاصل یہ تھا کہ مغرب مسلمانوں کے اس انتخاب و اختیار کے رویہ سے اتفاق نہیں کرتا۔(۱۸)

عالم اسلام کے حوالہ سے مغرب کی حکمت عملی:

مغرب عالم اسلام میں بالخصوص دنیائے مشرق میں اٹھنے والی تحریکات اور نئے رجحانات پر برابر غور و فکر کر رہا ہے۔ مستقبل میں ان تحریکات کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے اور ان سے کس طرح فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اس حوالہ سے مغرب میں ایک طویل عرصہ سے منصوبہ بندی تیار کی جارہی ہے۔ مغرب اسلام کے حوالہ سے جو منفی تدابیر کر رہا ہے ڈاکٹر صاحب اس کے تین رخ متعین کرتے ہیں جسے وہ three pronged strategy کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی بیان کردہ یہ تین حکمت عملیاں درج ذیل ہیں:

(i) اسلامی تحریکات اور تنظیموں سے ڈیل کرنے کی حکمت عملی۔

(ii) دنیائے اسلام کے نقشے کی از سر نو تشکیل کی حکمت عملی۔

(iii) دنیائے اسلام کی تہذیب و تمدن کو ختم کرنے کی حکمت عملی۔

(i) پہلی حکمت عملی:

ان حکمت عملیوں میں سے پہلی حکمت عملی پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

''جہاں تک پہلی حکمت عملی کا تعلق ہے کہ جو لوگ دین کا کام کر رہے ہیں ان سے کس طرح ڈیل کی جائے؟ اس کے لیے آج سے پچیس تیس سال پہلے سے کوششیں شروع ہوئیں اور ان پچیس تیس سالوں میں یہ مطالعہ کیا گیا کہ دنیائے اسلام میں اسلام کا نام لینے والے کون کون ہیں اور کہاں کہاں ہیں۔''(۱۹)

اس حوالہ سے ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنا ایک ذاتی مشاہدہ اور تجربہ بھی ذکر کیا ہے۔ جس میں امریکہ کے ایک پروفیسر نے انہیں دینی مدارس کے حوالہ سے تحقیق کرنے کے عوض دنیا کی بہترین یونیورسٹی میں داخلہ اور اسکالرشپ کی پیش کش کی تھی۔(۲۰) مقصد اس کا یہ تھا کہ ان دینی اداروں اور تحریکات پر معلومات کو اکٹھا کیا جائے۔ تاہم ڈاکٹر صاحب نے اس پیش کش کو مسترد کر دیا۔ یہ واقعہ اکتوبر ۱۹۷۶ء کا ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مغرب ان دینی اداروں اور تحریکات سے کتنی دلچسپی رکھتا ہے۔ نیز اس حوالہ سے ان کی معلومات کے حصول کے طریقہ کار کی بھی وضاحت ہوتی ہے۔ مغرب کی اس حکمت عملی میں گزشتہ ایک دہائی سے کافی شدت نظر آرہی ہے۔ اور اگر حقیقت پسندانہ نظروں سے دیکھیں تو مغرب اپنی اس حکمتِ عملی میں بڑی حد کامیاب بھی نظر آتا ہے۔

(ii) دوسری حکمت عملی:

مغرب کی دوسری حکمتِ عملی کے حوالہ سے ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

"حکمت عملی کا دوسرا حصہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ جغرافیائی حیثیت پر نظر ثانی کی جائے، دنیائے اسلام کے سیاسی نقشے کو تبدیل کیا جائے۔"(۲۱)

مغرب کی ہٹ لسٹ پر کون کونسے اسلامی ممالک ہیں جن کے جغرافیائی نقشے تبدیل کرنا مقصود ہے وہ ڈاکٹر صاحبؒ کے مطابق درج ذیل ہیں:

(۱) پاکستان (۲) انڈونیشیاء (۳) ملائشیاء (۴) سعودی عرب (۵) مصر (۶) عراق (۷) ایران

ان اسلامی ممالک کے جغرافیائی نقشے تبدیل کرنے سے مغرب کے لیے انہیں کنٹرول کرنا اور ان پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا آسان ہوگا۔ نیز اس سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوگا کہ اسلامی دنیا فرقہ در فرقہ بٹتی چلی جائے گی۔

(iii) تیسری حکمت عملی:

لیکن اگر مغرب اپنی اس حکمتِ عملی میں کامیاب نہیں ہوتا تو اس کا سائیڈ پلان بھی انہوں نے نہ صرف تیار کر رکھا ہے بلکہ اس پر بڑے زور و شور سے مصروف عمل بھی ہیں۔ یہ تیسری حکمت عملی کیا ہے اس پر ڈاکٹر صاحب نے بڑا محققانہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ اسے آپ ڈاکٹر صاحبؒ کی زبانی سنیے:

"اگر دنیائے اسلام میں یہ تبدیلی نہ آسکے۔۔۔ تو پھر دنیائے مغرب کو کیا کرنا چاہیے؟ اس کے لیے تیسری حکمتِ عملی بھی تیار کی جا چکی ہے اور اس پر عمل درآمد کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ یہ تبدیلی گلوبلائزیشن کے نام پر آرہی ہے۔"۔(۲۲)

گلوبلائزیشن کے حوالہ سے ہمارے ہاں ایک طبقے کی رائے یہ ہے کہ گلوبلائزیشن انتہائی مفید چیز ہے اور اسے اختیار کرنے سے ہم لوگ بہت ترقی کر جائیں گے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے مطابق یہ گلوبلائزیشن دراصل مغرب کی تیسری حکمتِ عملی ہے جس میں بالخصوص دنیائے اسلام اور بالعموم تیسری دنیا کے غریب پسماندہ ممالک کی تہذیب کو اپنی تہذیب کا تابع بنانا مقصود ہے۔

اس حوالہ سے ڈاکٹر صاحبؒ قرآن کریم کی آیت: " وَلَن تَرْضَىٰ عَنكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ حَتَّىٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ "(۲۳) کا حوالہ دیتے ہوئے اس طبقہ کی خوش فہمی اور سادہ لوحی پر تبصرہ کرتے ہیں کہ

"(یہ) قرآن پاک کا اعلان ہے اور صیغہ تاکید میں ہے۔ یہود و نصاریٰ ہر گز ہر گز راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کی ملت کا اتباع نہیں کروگے۔ یہاں محض دین کا اتباع نہیں، ملت کا ذکر ہے، ملت اس دین کو کہتے ہیں جس میں کلچر بھی شامل ہے۔ شعائر بھی شامل ہیں اور جس میں سویلائزیشن بھی شامل ہے۔ جب تک تم سو فیصد ان کے رنگ میں نہیں رنگ جاؤگے وہ تم سے راضی نہ ہوں گے۔"(۲۴)

ڈاکٹر صاحبؒ گلوبلائزیشن کے زبردست ناقد ہیں۔ ان کے نزدیک گلوبلائزیشن کا مقصد دنیا کو تین حصوں میں تقسیم کرنا ہے:

(i) درجہ اول: جس میں یورپ اور امریکہ وغیرہ کے لوگ شامل ہوں

(ii) درجہ دوم: جس میں دیگر غیر مسلم اقوام ہوں مثلاً چین یا سنگاپور وغیرہ

(iii) درجہ سوم: جملہ اسلامی ممالک اور دیگر غریب ممالک وغیرہ

ڈاکٹر صاحبؒ کے مطابق دنیا کی اس تقسیم کے نتیجے میں ان طبقات کی ذمہ داریاں اور فرائض کا خلاصہ یہ ہے۔

درجہ اول کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ جدید سائنسی ترقی اور دنیا کی صنعت و معیشت پر کنٹرول رکھیں۔ درجہ دوم کا کام یہ ہوگا کہ وہ درمیانے درجے کی چھوٹی انڈسٹری یا درمیانے درجے کی تجارت پر اکتفا کریں۔ جبکہ درجہ سوم کی ذمہ داری یہ ہوگی کہ وہ درجہ اول کے ممالک کے لیے مزدور فراہم کریں۔ نیز ان کے فائدہ کے لیے خام مواد فراہم کریں۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ:

"یہ دو کام ہمارے ذمے ہوں گے۔ اس کے علاوہ اس نئے نظام (گلوبلائزیشن) کے تحت ہمیں کوئی کردار ادا کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔"(۲۵)

اگر ڈاکٹر صاحبؒ کے اس تجزیہ کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا جائے تو یہ بات بڑی حد تک مبنی بر حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ آج ہمارے نوجوان کے ذہن میں ترقی اور اچھے مستقبل کا زیادہ سے زیادہ معیار یہ ہے کہ وہ درجہ اول کے کسی ملک میں تعلیم یا ملازمت کے حصول کی راہیں تلاش کرے یا پھر کسی ملٹی نیشنل کمپنی کی ملازمت اختیار کرلے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نوجوانوں کی اس سطحی سوچ پر بڑے آزردہ اور کبیدہ خاطر دکھائی دیتے ہیں۔

مسلمانوں کی جذباتیت اور مغرب:

وہ مسلمانوں کی صرف اس سوچ پر مغموم نہیں بلکہ دنیائے اسلام کے خلاف مغرب کی ان سازشوں کے برعکس دنیائے اسلام بالخصوص دنیائے مشرق کی بے حسی اور سطحیت و جذباتیت ہر دو رویوں پر

بھی مغموم نظر آتے ہیں۔ ان کے مطابق مغرب کی ان چیرہ دستیوں کے مقابلہ میں مسلمانوں میں ایک سطحیت وجذباتیت کا حامل طبقہ ابھر کر سامنے آیا ہے۔ جو اپنے عاجلانہ فیصلوں اور حکمت سے عاری جذباتی نعروں کے ذریعہ مغرب کے اس رویہ کا جواب دینا چاہتا ہے۔

ڈاکٹر صاحبؒ کے مطابق اس طبقہ کی جذباتیت کو مغرب بڑے غلط انداز میں پیش کرتا ہے اور انہیں اپنے اس دعویٰ کا ہم خود جواز فراہم کرتے ہیں کہ مسلمان دہشت گرد اور انتہا پسند ہیں۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر صاحب رقمطراز ہیں کہ:

''اہل مغرب یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان میں جو دینی تعلیم کے ادارے ہیں ان کو ختم کر دیا جائے۔ کریش ڈاؤن کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مذہبی اداروں کا دنیا میں ایک بارڈر لائنز اور جنگ جو قسم کا امیج سامنے لایا جائے۔ وہ امیج ہم اور آپ خود سامنے لا رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ ہمارے اپنے پُرجوش اور فہم سے عاری لوگ اس امیج کو خود پیدا کر رہے ہیں۔ ہمارے بعض پرجوش لیکن کم فہم اور بے بصیرت لوگوں کی حرکتوں سے یہ تاثر دن بہ دن مضبوط ہوتا جا رہا ہے کہ یہ مدرسے جنگ جوؤں کے اڈے ہیں۔ اور پورے عالم اسلام میں یہ فساد اور اختلاف کا مرکز ہیں۔ اس لیے ان پر ضرب لگائی جائے۔''[۲۶]

مسلمانوں میں یہ بات بڑی تیزی سے سرایت کر رہی ہے کہ وہ مغرب کے استعماری اور ظالمانہ رویہ کے خلاف جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتے اور اپنے عزائم کا بہادرانہ انداز میں اظہار کرتے اور اسی کو اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ حالانکہ مغرب اپنے عزائم کے اظہار کے حوالہ سے انتہائی محتاط رویہ اپنائے ہوئے ہے۔ وہ انتہائی خاموشی اور چالاکی سے اپنے عزائم کی منصوبہ بندی کرتے ہیں اور پھر اسی رازداری سے انہیں پایہ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ مغرب کے اسی طرز عمل اور ہمارے موجودہ جذباتی رویوں پر ڈاکٹر صاحب نے بڑا وقیع تجزیہ کیا ہے جو لائق مطالعہ ہے۔

دوہرا نظام تعلیم مغرب کا تحفہ ہے:

ڈاکٹر صاحبؒ دین اور دنیا کی الگ الگ تعلیم کے بھی مخالف ہی۔ وہ مدارسِ دینیہ کے موجودہ نظام سے غیر مطمئن نظر آتے ہیں اور اس طرح کی تعلیم کو بھی مغرب کا تحفہ قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

''یہ تاثر کہ دینی اور دنیوی علوم جدا جدا اور الگ الگ بہنے والی مختلف نہریں ہیں، اسلامی تاثر نہیں، بلکہ یہ مغرب کا تحفہ اور مغربی سیکولرازم کے باقیات سیئات و اثراتِ بد میں سے ہے۔ مجھے یہ بات کہنے میں کوئی تامل نہیں اور میں بغیر کسی تردد کے یہ بات عرض کرتا ہوں کہ جب تک مذہبی اور دنیاوی تعلیم کے یہ دو نظام الگ الگ برقرار رہیں گے، دنیائے اسلام میں سیکولرازم کو فروغ ملتا رہے گا۔''[۲۷]

مغربی مستشرقین کا منفی کردار:

مغرب نے اپنی نوآبادیاتی تاریخ سے یہ سبق سیکھا ہے کہ جب تک کسی قوم کی تہذیب و تمدن کو اپنے رنگ میں نہیں رنگا جائے گا اس وقت تک وہ مکمل طور پر اپنا جبری استبداد اور ظلم و ستم پر مبنی نظام قائم نہیں رکھ سکتے۔ چنانچہ ایک طویل عرصہ سے مغربی دانشور اور مستشرقین دنیائے اسلام میں روشن خیالی اور تجدد پسندوں کے لیبل کو استعمال کرکے مسلم اُمّہ کو یہ باور کروانے کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ ان کی بقا اور ترقی کا راز اسی نسخہ کیمیا میں مضمر ہے۔

اس تمام عرصہ میں مستشرقین نے سب سے پہلے قرآن کریم وسنت نبویہ اور پھر بتدریج سیرت مطہرہ اور اسلامی تاریخ کے حوالہ سے دنیائے اسلام کو شکوک و شبہات میں مبتلا کرنے کی کوشش کی۔ انیسویں صدی میں جب مستشرقین نے دیکھا کہ پورا عالم اسلام ان کے زیر تسلط ہے تو ان کو مسلمانوں کی تہذیبی روایات اور مذہبی اعتقادات کو ٹھیس پہنچانا بہت آسان لگا۔ اس سے قبل عالمِ اسلام عروج کی بہاریں دیکھ چکا تھا۔ لیکن اب واسطہ غلامی سے تھا۔ غلامی کا ایک اثر اقوام پر یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے اذہان بھی غلام ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ بات بڑے وثوق سے کی جاسکتی ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں نے مغرب سے بڑی پامردی سے مذہبی اعتقادات اور تہذیبی روایات کی جنگ لڑی۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ:

''ہمارے اس برصغیر میں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ[۲۸] اور مولانا محمد قاسم نانوتوی[۲۹] نے اس سلسلہ میں گرانمایہ خدمات سرانجام دی ہیں۔''[۳۰]

اس حوالہ سے ڈاکٹر صاحبؒ سرسید احمد خان[۳۱] کی بھی تعریف کرتے ہیں جنہوں نے انگریز مستشرق ولیم میور[۳۲] کی کتاب The Life of Muhammad کا جواب خطبات احمدیہ کے نام سے دیا تھا۔[۳۳]

یہ دور برصغیر پر بڑے ابتلا کا دور تھا۔ اگر یہ مستشرقین اور پادری اپنے مشن میں کامیاب ہو جاتے تو آج برصغیر کی حالت اندلس سے بھی گئی گزری ہوتی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس دور میں اس طرح کے لوگ پیدا فرمائے جنہوں نے مغرب کے اس جدید فلسفیانہ اور منطقیانہ شکوک و شبہات کا مبنی بر عقل جواب دیا۔ اور امت کو ایک عظیم آزمائش سے بچالیا۔ چنانچہ ہمیں ان حضرات کے بعد شبلی نعمانی[۳۴] سے لے کر علامہ اقبال تک مغرب کے اس لادینی فلسفہ کا رد واضح طور پر دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ بھی اسی فکر کا تسلسل ہیں۔

بہت سے لوگوں کا یہ ماننا ہے کہ مستشرقین دراصل ایک غیر جانبدار جماعت ہے اور ان کا حکمرانوں سے کبھی کوئی ربط نہیں رہا۔ مگر ڈاکٹر صاحبؒ کے مطابق مستشرقین عیسائیوں کی وہ جماعت ہے جو بہ ظاہر غیر جانبدار اور علمی تحقیق کے حوالہ سے متعارف ہے، لیکن اگر ان کی سرگرمیوں کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جاے تو یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مستشرقین کا تبشیری گروہ[۳۵] سے بڑا گہرا تعلق ہے بلکہ حکمرانوں کے ساتھ بھی ان کے روابط بڑے مضبوط ہیں۔[۳۶]

مستشرقین کا پہلا حملہ:

ان مستشرقین نے سب سے پہلا حملہ قرآنِ کریم پر کیا۔ مغرب کے بڑے بڑے مستشرقین اس کوشش کو لے کر کھڑے ہوئے اور انہوں نے اپنی زندگیاں اس مذموم مقصد کے لیے صرف کر دیں۔ نولڈیکے[۳۷] ایک مشہور مستشرق ہے اس کے متعلق ڈاکٹر صاحبؒ نے لکھا ہے کہ

"(اس) نے اپنی زندگی کے کم از کم چالیس سال اس کام پر لگائے کہ وہ قرآنِ پاک کا مطالعہ کرے اور مطالعہ کرنے کے بعد اس نے دو جلدوں پر مبنی قرآنِ پاک کی تاریخ لکھی۔ لیکن ان کو یہ اندازہ جلد ہی ہو گیا کہ قرآنِ پاک اتنی مضبوط بنیادوں پر قائم ہے کہ ان بنیادوں کو آسانی کے ساتھ ہلایا نہیں جا سکتا۔"[۳۸]

ڈاکٹر حمید اللہ[۳۹] نے خطبات بہاولپور میں لکھا ہے کہ جرمنی کے عیسائی پادریوں نے انجیل کے قدیم ترین مخطوطے جمع کیے اور ان کے ایک ایک لفظ کا تقابلی مطالعہ کیا۔ اس انجمن کی حتمی رپورٹ کے مطابق ان نسخوں میں تقریباً دو لاکھ مقامات پر تحریف پائی جاتی ہے۔ جن میں سے ۱/۸ تحریفات کا تعلق انتہائی اہم مقامات سے ہے۔ اس کے بعد میونخ یونیورسٹی نے ۱۹۳۳ء میں یہی تجربہ قرآن کے ساتھ کیا اور ۴۲ہزار قرآن کے نسخوں کے ایک ایک حرف کا مقابلہ کیا۔ اس انجمن کی آخری رپورٹ کے مطابق قرآن میں بعض جگہ کتابت کی غلطیاں تو ملتی ہیں لیکن ایک بھی مقام ایسا نہیں ملا جس میں لفظی تحریف پائی گئی ہو۔[۴۰]

ڈاکٹر صاحبؒ نے غیر مسلموں کی اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"غیر مسلموں کی اس رپورٹ سے بھی یہی بات واضح ہوتی ہے کہ قرآن مجید کو صحابہ کرامؓ نے اس طرح دل و جان سے محفوظ کیا کہ اس سے بڑھ کر انسانی ذہن اور دماغ میں کسی چیز کی حفاظت کا خیال آ نہیں سکتا"۔[۴۱]

(ii) مستشرقین کا دوسرا حملہ:

قرآن کریم کے بعد مستشرقین نے اگلا نشانہ احادیث مبارکہ کو بنایا۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحبؒ کے مطابق انیسویں صدی کے وسط میں جو بنیادی اعتراضات کیے گئے تھے ان سب کی اصل بنیاد یہ غلط فہمی تھی

کہ ذخیرہ احادیث تاریخی طور پر ثابت شدہ نہیں ہے۔ اور غیر مستند ہے۔[۴۲] ڈاکٹر صاحبؒ کے مطابق اب یہ اعتراضات نہیں کیے جاتے کیونکہ ان کے مفروضے غلط ثابت ہو چکے ہیں۔ لیکن آج کل جو اعتراض ہو رہے ہیں وہ احادیث کے مندرجات پر کیے جا رہے ہیں۔[۴۳] ڈاکٹر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ:

''میں (مغربی مستشرقین کے) اعتراضات کا جواب دینے کے اس طریقے کو صحیح نہیں سمجھتا کہ پہلے آپ اعتراض نقل کریں اور پھر اس کا جواب دیں۔ آپ اصل بات کو اس طرح بیان کریں کہ اعتراض پیدا ہی نہ ہو۔ یہ زیادہ دیرپا اور زیادہ موثر طریقہ ہے۔''[۴۴]

گولڈ زیہر[۴۵] جو ایک مشہور مستشرق گزرا ہے اس نے احادیث مبارکہ پر سب سے پہلے شکوک و شبہات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے اس منفی کام کو اس کے شاگرد جوزف شاخت[۴۶] نے آگے بڑھایا۔ اس نے احادیث کے موضوع پر کتب لکھیں۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے اس کے اعتراضات کا جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''اس کا (جوزف شاخت) کا زور صرف احادیث احکام پر تھا اور اس نے تمام دلائل کو اور اسی اسلوبِ استدلال کو استعمال کیا جو گولڈ زیہر کا تھا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ احادیثِ احکام سب کی سب جعلی ہیں، فرضی ہیں اور ان کا رسول اللہ ﷺ سے کوئی تعلق نہیں۔ مسلمان علماء نے ایک ایک کرکے اس کا جائزہ لیا اور ان دلائل کی کمزوری واضح کی۔ جب ان کو یہ اندازہ ہو گیا کہ حدیث کی اتنی مضبوط بنیاد ہے کہ اس کو آسانی سے نہیں گرایا جا سکتا تو پھر دوبارہ ان کی توجہ سیرت پر گئی''۔[۴۷]

(iii) مستشرقین کا تیسرا حملہ:

قرآن و سنت کی مضبوط بنیادوں کو متزلزل نہ ہوتے دیکھ کر مغربی مستشرقین نے سیرت نبویہ ﷺ کو نشانہ بنایا۔ اس عمل سے ان کی غرض یہ تھی کہ نبی کریم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ اور ان سے منسوب روایات واقعات کو مشکوک بنا کر اس کی عملی افادیت اور اہمیت کو کم کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے مغربی مستشرقین نے نبی کریم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر بڑے رکیک اور گھٹیا الزامات لگائے۔

ڈاکٹر صاحبؒ نے مستشرقین کے ان اعتراضات کا بڑا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ولیم میور نے اعتراض کیا ہے کہ کہ نبی کریم ﷺ کا تعلق حضرت اسماعیل علیہ السلام سے نہیں تھا۔ نیز بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نہیں بنایا تھا۔ ڈکٹر صاحب نے اس اعتراض کا بڑی عمدگی سے جواب دیا ہے۔[۴۸] اسی طرح ڈاکٹر صاحبؒ نے سیرت کے مآخذ پر مغربی مستشرقین کے کیے جانے والے اعتراضات کا بھی بڑا عمدگی سے محاکمہ کیا ہے[۴۹] ڈاکٹر صاحب نے مستشرقین کے اس اعتراض کا بھی جواب دیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا

خاندان بلحاظ عزت وشرافت عرب میں کم تر خاندان تھا۔[۵۰] انہوں نے نبی کریم ﷺ کے خاندان کی افضلیت بلند مقام و مرتبہ کو بڑے عمدہ دلائل سے مرصع کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے مستشرقین کے غلط تراجم اور تفہیم کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اس حوالہ سے انہوں نے ڈاکٹر مار گولیتھ[۵۱] کے کئی مضحکہ خیز تراجم کا حوالہ بھی دیا ہے۔[۵۲] ان اعتراضات کا جواب دینے کے ساتھ ساتھ دور حاضر میں علم سیرت کو درپیش چیلنجز کے حوالہ سے ڈاکٹر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

"اب جو رجحان ہے وہ سیرت پر بہ حیثیت مجموعی حملے کا نہیں ہے، بلکہ جزوی واقعات کو نشانہ بنانے کا ہے۔"[۵۳]

ڈاکٹر صاحبؒ نے دورِ حاضر میں مغربی مستشرقین کے عمومی رویہ کے حوالہ سے اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے: "یہ بات اطمینان بخش ہے کہ اب مغرب میں سیرت کا مطالعہ سنجیدگی سے ہونے لگا ہے، پرانے تعصّبات ایک ایک کرکے ختم ہو رہے ہیں یا کم از کم کمزور پڑ رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کو یہ احساس ہو چلا ہے کہ پرانے تعصّبات کا علمی اعتبار سے دفاع نہیں کیا جاسکتا اور صدیوں پرانے مستعمرانہ تصورات کو باقی نہیں رکھا جاسکتا۔ اس لیے اب مغرب کے انصاف پسند محققین زیادہ حقیقی اور زیادہ بہتر مطالعہ کی طرف آرہے ہیں۔"[۵۴]

(iv) مستشرقین کا چوتھا حملہ:

تاہم یہ بات مسلمہ ہے کہ مغرب آج بھی اپنے استعماری نظریات کی تکمیل کے لیے دن رات محنت کر رہا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ کسی طرح وہ دنیائے اسلام کی تہذیب کو شکست و ریخت سے دوچار کریں۔ اس کے لیے وہ اب اعتراضات بھی بڑے جدید انداز اور جدید طرز کے کر رہے ہیں۔ قرآن وسنت اور سیرت نبویہ کے بعد ان کے اعتراضات اب مسلمانوں کے فقہی ذخیرہ پر کیے جارہے ہیں۔ اگرچہ ہمارا فقہی ذخیرہ اپنی اہمیت اور معنویت کے لحاظ سے انتہائی زرخیز ہے لیکن جمود کی روش نے مغرب کو بجا طور پر یہ اعتراض کرنے پر مجبور کیا ہے کہ اسلامی قانون دورِ حاضر کا ساتھ دینے کی اہلیت نہیں رکھتا۔ دنیا میں ہونے والی تیز رفتار تبدیلی نے اسلامی قانون کے لیے بہت سے سوالات کھڑے کر دیے ہیں۔ ان سوالات کے اجتماعی حل کے لیے اجتماعی اجتہادات سے فائدہ اٹھایا جارہا ہے۔ ڈاکٹر صاحبؒ لکھتے ہیں کہ:

"اس اجتماعی اجتہاد کے نتیجہ میں فقہی مسالک کی حدود مٹ رہی ہیں۔ ایک نئی فقہ وجود میں آرہی ہے۔ جس کو نہ فقہ حنفی کہہ سکتے ہیں نہ مالکی، نہ حنبلی، نہ جعفری۔ بلکہ اس کو اسلامی فقہ ہی کہا جائے گا۔ میں اس کے لیے Cosmopolitan Fiqh یعنی عالمی یا ہر دیسی فقہ کی اصطلاح استعمال کرتا ہوں۔"[۵۵]

ڈاکٹر صاحبؒ کے اس فقہ آفاقی کے تصور پر اگرچہ بحث کی جاسکتی ہے اور اس پر حال ہی میں تنقیدی جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ آج نہ سہی کل سہی ہمیں مغرب کے اعتراضات سے قطع نظر ہو کر محض اپنے ملی تشخص اور مذہبی اقدار کی حفاظت کے لیے ڈاکٹر صاحبؒ کے اس تصور سے استفادہ کرنا ہوگا۔

مغرب کا منفی کردار اور اسلام کا مستقبل:

ڈاکٹر صاحب کی فکر کا ایک نمایاں پہلو یہ بھی ہے کہ وہ مغرب اور مغربی مستشرقین کے اس معاندانہ اور تخریب کارانہ رویہ پر محض جذباتی بیان بازی پر اکتفا نہیں کرتے اور نہ ہی ان کا وژن دنیائے اسلام میں ان سازشوں کا رعب طاری کرنا ہے۔ بلکہ وہ ان حالات میں بھی مغربی تہذیب پر اسلامی تہذیب کی فوقیت ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں: چنانچہ لکھتے ہیں:

''آج مغربی تہذیب ان تمام میدانوں میں بہت غالب اور بالادست معلوم ہوتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں اسلامی تہذیب کو وہ بالادستی حاصل نہیں۔۔۔۔۔البتہ یہ دونوں تہذیبیں ایک اعتبار سے برابر ہیں۔ وہ یہ کہ ان دونوں تہذیبوں کے مؤیدین اس عزم وارادہ سے بھرپور ہیں جو عزم وارادہ کسی قوی تہذیب کے پیروکاروں میں پایا جاتا ہے۔ ایک اعتبار سے اسلامی تہذیب کو بالادستی آج بھی حاصل ہے۔ وہ اخلاقی بالادستی ہے''۔(۵۶)

دورِ حاضر میں مغربی پروپیگنڈے اور شعور کی کمی کی وجہ سے مسلمانوں میں ایک طبقہ وہ بھی موجود ہے جو مغرب کے تہذیبی اثرات کے زیرِ اثر ہر جگہ اس بات کی جگالی کرتے نظر آتا ہے کہ ہماری تہذیب مغربی تہذیب کے آگے گھٹنے ٹیک چکی ہے۔ اس میں اب کوئی دم خم باقی نہیں رہا۔ اس طبقہ کی سوچ کی نفی کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحبؒ اسلام اور اسلامی تہذیب کا مستقبل بڑا تابناک دیکھتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

''اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب کے درمیان کشمکش کی یہ داستان بظاہر حوصلہ شکن معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ شاید مستقبل کی لگامیں مسلمانوں کے ہاتھوں سے چھوٹ چکی ہیں۔ لیکن معاملات کو ذرا غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اس پوری کشمکش کے دوران مسلمانوں کا بہت بڑا طبقہ، عامۃ الناس کی بہت بڑی تعداد نہ صرف پر امید رہی ہے بلکہ ان مصائب اور تکالیف کے سمندروں سے گزرنے کے نتیجے میں ان کا ایمان اسلامی شریعت پر پہلے سے بہت زیادہ مضبوط ہوا ہے۔ جدید تعلیم یافتہ طبقے کی ایک بہت بڑی تعداد از سر نو اسلامی شریعت کی طرف متوجہ ہوئی ہے اور ایک بہت بڑا طبقہ ایسا

پیدا ہوا ہے۔ جو جہاں مغرب کو خوب سمجھتا ہے وہاں اسلامی شریعت پر ایمان اور شریعت کے از سر نو نفاذ کے لیے اپنے عزم میں کسی بھی دوسرے پر جوش مخلص مسلمان سے کم نہیں۔"(۵۷)

ڈاکٹر صاحبؒ کا یہ تجزیہ بالکل درست ہے۔ کیونکہ آج مغربی دنیا ہی کے اعداد و شمار یہ بتا رہے ہیں کہ اسلام مغرب میں پھیلنے والے مذاہب میں سب سے پہلے نمبر پر ہے۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنا ایک ذاتی مشاہدہ بھی بیان کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۹۷۴یا۱۹۷۵میں مشہور اسلامی مفکر ڈاکٹر دوالیبی فرانس کے کچھ مسلمانوں کی شکایات لے کر رابطہ عالم اسلامی کے حوالہ سے فرانس کے صدر سے ملے۔ اس موقع پر فرانسیسی صدر نے مسکرا کر کہا ڈاکٹر دوالیبی آج آپ فرانس کے مسلمانوں کی طرف سے مجھ سے بات کرنے آئے ہیں۔ لیکن ہو سکتا ہے کہ اکیسویں صدی میں میرے جانشین فرانس کے عیسائیوں کی طرف سے بات کرنے کے لیے آپ کے جانشینوں سے ملنے آئیں"۔(۵۸)

اگر آج ہم اپنے نوجوانوں کو مغرب کی جانب سے درپیش جدید چیلنجز سے کماحقہ آگاہی دیتے ہیں اور انہیں ان چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی کھوئی ہوئی عظمت رفتہ حاصل کرلیں اور اس حوالہ سے ڈاکٹر صاحبؒ کی فکر ہمارے لیے صراط مستقیم کی حیثیت رکھتی ہے۔

حوالہ جات وحواشی

(۱) سورۃ الاحزاب کی اس آیت نمبر ۴۰ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے بعد اب کوئی دوسرا نبی نہیں آئے گا۔ نیز خاتم النبیین کے یہ الفاظ بخاری شریف میں بھی آئے ہیں۔ ملاحظہ ہو بخاری، کتاب المناقب، باب خاتم النبیین، حدیث ۳۴۴۷۔

(۲) یہ احادیث مبارکہ کا ایک جملہ ہے، جس کا معنی ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اس حدیث کو مفتی محمد شفیع نے معارف القرآن میں صحیح بخاری، مسلم اور مسند احمد سے تخریج کیا ہے۔ ملاحظہ ہو معارف القرآن، جلد ہفتم، ص۱۶۶۔

(۳) اس حدیث مبارکہ کا مطلب ہے کہ علماء انبیاء علیہم السلام کے ورثاء اور جانشین ہیں۔ اس حدیث کو صاحبِ مشکوٰۃ نے ترمذی، ابوداؤد، ابن ماجہ اور مسند احمد سے روایت کیا ہے۔ ملاحظہ ہو مشکوٰۃ المصابیح، کتاب العلم، حدیث ۱۵۔

(۴) یہ ایک حقیقت ہے کہ تاریخِ اسلام کے ہر دور میں اس دور کے تقاضوں کے مطابق مجدد پیدا ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے لے کر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی(متوفی ۱۷۶۲ء) تک بالخصوص اور دورِ حاضر تک بالعموم اس طرز فکر کے رجال پیدا ہوتے رہے ہیں۔ جنہوں نے دین کو درپیش چیلنجز کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر صاحبؒ بلا شبہ اس دور میں مولانا ابوالحسن علی ندوی (متوفی ۱۹۹۹ء) اور ڈاکٹر محمد حمید اللہؒ (متوفی ۲۰۰۲ء) کے پایہ کے عالم تھے۔

(۵) حکیم الامت ڈاکٹر محمد اقبال ۹ نومبر ۱۸۷۷ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ نے مغربی علوم وافکار پر بڑی کڑی تنقید کی ہے۔ آپ کی وفات ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ ئمیں ہوئی۔

(۶) عطاء اللہ ۲۴۹ شیخ، اقبال نامہ، ص ۹۹۔۹۸، اقبال اکیڈمی، لاہور، ۲۰۰۵ء۔

(۷) ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ کی پیدائش ۱۸ ستمبر ۱۹۵۰ء میں دہلی میں ہوئی۔ آپ کے والد ماجد کا نام مولانا محمد احمد فاروقی تھا۔ وہ تصوف میں مولانا اشرف علی تھانویؒ (متوفی ۱۹۴۳ء) سے بیعت تھے۔ تبلیغی جماعت کے بانی مولانا محمد الیاسؒ (متوفی ۱۹۴۴ء) اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ (متوفی ۱۹۸۲ء) ڈاکٹر صاحبؒ کی والدہ کے سگے ماموں تھے۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے ۲۶ دسمبر ۲۰۱۰ء میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔

(۸) ماہنامہ تعمیر افکار، ج ۸، شمارہ ۱۰، ص ۲۰۔

(۹) ایضاً، ص ۲۱۔

(۱۰) غازی، محمود احمد، محاضراتِ شریعت، ص ۴۶۶، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور، ۲۰۰۹ء۔

(۱۱) ایضاً، ص ۴۵۵۔

(۱۲) ماہنامہ تعمیر افکار، ج ۸، شمارہ ۱۰، ص ۲۶۔

(۱۳) غازی، محمود احمد، محاضراتِ شریعت، ص ۵۴۸۔

(۱۴) ایضاً، ص ۴۵۳۔۴۵۴

(۱۵) قرآن کریم میں ارشاد ہے "کئی لایکون دولۃ بین الاغنیاء منکم" (سورۃ الحشر آیت : ۷) یعنی دولت تمہارے امراء ہی میں گردش نہ کرتی رہے۔

(۱۶) غازی، محمود احمد، محاضرات معیشت وتجارت، ص ۱۴۳، الفیصل ناشران وتاجرانِ کتب لاہور، ۲۰۱۰ء۔

(۱۷) غازی، محمود احمد، مسلمانوں کا دینی وعصری نظام تعلیم، ، ص ۱۸۹، الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ، ۲۰۰۹ء

(۱۸) ایضاً

(۱۹) ماہنامہ تعمیر افکار، ج ۸، شمارہ ۱۰، ص ۲۹۔

(۲۰) ایضاً، ص ۳۰۔

(۲۱) ایضاً، ص۳۱۔

(۲۲) ایضاً، ص۳۵۔

(۲۳) البقرہ، آیت: ۱۲۰۔

(۲۴) ماہنامہ تعمیر افکار، ج۸، شمارہ ۱۰، ص۳۵۔

(۲۵) ایضاً، ص۳۶-۳۷۔

(۲۶) ایضاً، ص۳۲۔

(۲۷) غازی، محمود احمد، مسلمانوں کا دینی و عصری نظام تعلیم، ص۱۹۲۔

(۲۸) مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ کی پیدائش ۱۸۱۸ء میں ہوئی اور وفات ۱۸۹۱ء میں ہوئی۔ بڑے جید عالم دین تھے۔ عیسائی مناظرین کا انتہائی عمدگی سے مقابلہ کیا۔

(۲۹) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ۱۸۳۲ء میں نانوتہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ آپ بڑے زبردست عالم دین تھے۔ دارالعلوم دیوبند آپ ہی نے قائم فرمایا۔ مولانا نے تمام عمر مغربی تہذیب کے علمبرداروں سے زبان و قلم کا جہاد کیا۔ آپ کی وفات ۱۸۸۰ء میں ہوئی۔

(۳۰) ماہنامہ تعمیر افکار، ج۸، شمارہ ۱۱، ص۲۹۔

(۳۱) سر سید احمد خان ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ آپ نے انگریز مستشرق ولیم میور کی کتاب The Life of Muhammad کا جواب خطبات احمدیہ کے نام سے لکھا۔ آپ کا انتقال ۱۸۹۸ء میں ہوا۔

(۳۲) ولیم میور، گلاسکو، اسکاٹ لینڈ میں ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوا۔ اس نے گلاسکو اور ایڈنبرا یونیورسٹی سے مروجہ تعلیم حاصل کی۔ برصغیر میں یوپی کا گورنر رہا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچایا۔ اس نے (The Life of Muhammad) نامی کتاب لکھی جو چار جلدوں میں ۱۸۶۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کا انتقال ۱۹۰۵ء میں ہوا۔

(۳۳) غازی، محمود احمد، محاضرات سیرت، ص۶۱۶، الفیصل ناشران و تاجران کتب لاہور، ۲۰۰۷ء

(۳۴) مولانا شبلی کا مکمل نام محمد شبلیؒ تھا۔ آپ مئی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ بڑے جید عالم دین تھے۔ سیرت النبی جیسی معرکۃ الآراء کتاب تصنیف کی جس میں بڑی خوبصورتی سے مغربی اعتراضات کے جوابات دیے۔ آپ کا انتقال ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء کو ہوا۔ تفصیل ملاحظہ ہو "یادگار شبلی" مصنفہ ایس۔ ایم اکرم۔

(۳۵) تبشیری گروہ سے مراد عیسائی مبلغین اور پادری ہیں۔ جو دین مسیحی کی تبلیغ کرتے ہیں۔

(۳۶) ماہنامہ تعمیر افکار، ج۸، شمارہ ۱۱، ص۲۹۔

(۳۷) اس کا مکمل نام تھیوور نولڈیکے تھا۔ ۱۸۳۶ء میں ہاربرگ میں پیدا ہوا۔ ۱۸۵۹ء میں فرانس کی اکادمی ادبیات نے اس کی کتاب "تاریخ قرآن" پر انعام سے نوازا۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں انتقال کیا۔

(۳۸) ششماہی السیرۃ عالمی کراچی، شمارہ ۲۵، ص ۴۱۷۔

(۳۹) ڈاکٹر محمد حمید اللہ ۱۹فروری ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ بڑے جید عالم دین اور محقق تھے۔ ۱۶۵سے زائد کتب اور تقریباً ۱۰۰۰کے قریب تحقیقی مقالات تحریر کیے۔ ۱۷دسمبر ۲۰۰۲ء میں انتقال ہوا۔

(۴۰) ڈاکٹر حمید اللہؒ نے تحریفات کی تعداد دو لاکھ تحریر کی ہے جو ۸/۱بنتی ہیں۔ جبکہ ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ نے پونے دو لاکھ تحریفات لکھی ہیں جو ۷/۱ بنتی ہیں۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ خطبات بہاولپور از ڈاکٹر حمید اللہ، ص ۱۶-۱۱۷اور محاضرات قرآنی از ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ، ص ۱۴۹-۱۵۰

(۴۱) غازی، محمود احمد، محاضرات قرآنی، ص ۱۵۱، الفیصل ناشران و تاجران کتب لاہور، ۲۰۰۷ء۔

(۴۲) غازی، محمود احمد، محاضرات حدیث، ص ۴۶۲، الفیصل ناشران و تاجران کتب لاہور ۲۰۰۴ء۔

(۴۳) ایضاً۔

(۴۴) غازی، محمود احمد، محاضرات سیرت، ص ۲۷۷ نیز محاضراتِ حدیث، ص ۴۶۲

(۴۵) گولڈزیہر ہنگری کا یہودی باشندہ تھا۔ وہ ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوا۔ اس نے جامعہ ازہر مصر سے تعلیم حاصل کی تھی۔ اس نے نبی کریم ﷺ کی سیرت پر کافی کچھ لکھا ہے۔ اس کا انتقال ۱۹۲۱ء میں ہوا۔

(۴۶) جوزف شاخت ۱۹۰۲میں پیدا ہوا۔ کولمبیا یونیورسٹی امریکہ میں قانون اسلامی کا پروفیسر رہا۔ اس نے ۱۹۶۹ء میں وفات پائی۔ اس پر ڈاکٹر محمد مصطفیٰ اعظمی نے بڑا جامع مضمون لکھا ہے۔ جس کا ترجمہ نشریات لاہور نے ''علوم اسلامیہ اور مستشرقین'' نامی کتاب میں شائع کیا ہے۔ ص ۴۱-۶۸ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

(۴۷) ششماہی السیرۃ عالمی کراچی، شمارہ ۲۵، ص ۴۱۸۔

(۴۸) ایضاً، ص ۴۲۸۔

(۴۹) ملاحظہ ہو السیرۃ عالمی شمارہ ۲۵، ص ۴۲۰-۴۲۷ نیز محاضرات سیرت، ص ۴۱۸۔

(۵۰) ششماہی السیرۃ عالمی کراچی، شمارہ ۲۵، ص ۴۲۹۔

(۵۱) مارگولیتھ کا اصل نام ڈیوڈ سیموئیل مارگولیتھ تھا۔ وہ ۱۸۵۸ء میں لندن میں پیدا ہوا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر کے طور پر کام کیا۔ اس نے نبی کریم ﷺ اور اسلام سے متعلق متعدد کتب تحریر کیں۔ اس کا انتقال ۱۹۴۰ء میں ہوا۔

(۵۲) ملاحظہ ہو ششماہی السیرۃ عالمی کراچی، شمارہ ۲۵، ص ۴۳۰-۴۳۲، نیز محاضرات سیرت، ص ۶۶۲۔

(۵۳) ششماہی السیرۃ عالمی کراچی، شمارہ ۲۵، ص ۴۲۴۔

(۵۴) غازی محمود احمد، محاضرات سیرت، ص ۵۱۔

(۵۵) ملاحظہ ہو ماہنامہ الشریعہ کی خصوصی اشاعت بیاد ڈاکٹر محمود احمد غازی، ص ۳۱۳-۳۲۱ نیز معارف اسلامی کی خصوصی اشاعت بیاد ڈاکٹر محمود احمد غازی، ص ۱۴۳-۱۷۲۔

(۵۶) غازی، محمود احمد، محاضرات شریعت، ص ۴۶۶۔

(۵۷) ایضاً، ص ۴۷۱۔

(۵۸) ماہنامہ تعمیر افکار، ج ۸، شمارہ ۱۰، ص ۴۰-۴۱۔